

اسلامی تحریکاتِ اصلاح

○ ××××× محمد سرور

ہنگری کا مشہور مستشرق، جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جبرانوس لکھتا ہے۔ "اگر مسلمان علماء کے شاندار علمی کارنامے نہ ہوتے، تو یورپ ابھی تک جہالت اور نکتیت میں پڑا سڑتا کئی طویل صدیوں تک دنیا کی روحانی روشنی اسلامی ممالک ہی سے پھوٹی رہی۔ اس کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ جہاں یورپ مادی اور معنوی دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا، وہاں مشرق قدیم مذہبی کتابوں کی خشک تاویلات اور ان کی نقلیں کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ماضی اور اس کی قدیم روایات کے حوالے کر دیا کہ وہ گویا اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہو گیا۔"

گزشتہ صدیوں میں مشرق کے مقابلے میں یورپ کی اس مادی و معنوی سر بلندی میں اگرچہ ان تاریخی اسباب کا بھی بڑا دخل ہے، جو اہل یورپ کے حق میں پیدا ہو گئے تھے، اور جن کی بدولت انھیں تمام دنیا پر چھپا جانے کا موقع مل گیا، مثلاً امریکہ کا انکشاف، مشرق اور مغرب کی تجارت کا مشرق قریب کے خشکی کے راستے کے بجائے سمندری راستوں سے ہونا اور مشین کی ایجاد لیکن مصنف مذکور کے نزدیک اس کے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مشرقی ذہنیت بھی ان کے جمود اور معاشی افلاس کا بہت حد تک سبب ہے۔ سولہویں صدی کے بعد سے مشرقی ذہنیت اپنی روایتی قسم کی زیریت کے زیر اثر جامد بن کر رہ گئی۔ اس جمود کا تجربہ کرتے ہوئے ایک دفعہ مصر کے مشہور اہل قلم محمد حسین ہیکل نے لکھا تھا: "جب خلافت اسلامیہ کا نظام شورلی سے وراثت میں مسلمانوں کی ناسندگی کے بجائے ان پر امیر بننے میں، اور ان کے نام سے بات کرنے کے بجائے ان پر استبداد کرنے میں بدل گیا، اور اسے ایسا حق سمجھ لیا گیا، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے، تو وہ دن تھا جب مسلمان فقہانے افراد کی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے اور اس نظام کی مخالفت کے لئے مزائیں تجویز کیں، اور ان سے ان کے لئے عذاب و عتاب اور اسبابِ احساسِ ذات اور شعور

انسانیت لوگوں کے دلوں میں کہیں ان پابندیوں کے خلاف کوئی حرکت نہ پیدا کر دے، انھوں نے اجتہاد کا دروازہ ہی سرے سے بند کر دیا اور اپنے مقرر کردہ احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کافر قرار دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو پر یہ فکری جمود اور دینی استبداد مسلط ہو گیا۔ اور ان کے اکثر علماء ایسی فرضی بحثوں میں الجھ گئے، جن کا عملی زندگی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

ہیکل صاحب اپنے اس مضمون میں، جس کا عنوان "الاجتہاد والتقليد" ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں کہ علماء کی ان بحثوں کا سارا زور الفاظ پر ہوتا۔ اور وہ روح سے بالکل خالی ہوتیں۔ اس نے ان میں سے اکثر کو الفاظ کا پرستش کرنے والا بنا دیا۔ اور وہ دین پر ایمان لانے والے نہ رہے۔ وہ مادی صورتوں کے پرستار ہو گئے اور اللہ کے پرستار نہ رہے، جو مادہ، زمان اور مکان سے منزہ اور مادی ہے اور یہ نتیجہ تھا تقلید کا، جس نے ذہنوں کو بخر بنا دیا، اور وہ اس قابل نہ رہے کہ ان بلندیوں تک پہنچ سکیں، جن کا دین اسلام متقاضی تھا۔ موصوفہ کے نزدیک اندھی تقلید خواہ وہ اپنے پہلوؤں کی ہو، یا یورپ کے نئے لوگوں کی، دونوں ایک سی ہیں اور دونوں سے ایک ہی سے نتیجے نکلتے ہیں، یعنی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور انسان میں آزادی فکری نہیں رہتی اور آگے کے بجائے ہمیشہ پیچھے کو دیکھتا ہے۔

مسلمانوں کے فکری جمود اور اندھی تقلید کے اس رجحان نے، جس کا آغاز ان کے ہاں سیاسی استبداد سے ہوا تھا، آخر میں مسلمانوں کو اس درجے پر پہنچا دیا کہ جب اٹھارھویں صدی میں یورپی اقوام نئے افکار و خیالات سے سرشار ہو کر مشرق کی طرف بڑھیں تو یورپی اسلامی دنیا ان کے قدموں میں تھی۔ اور اس کی معاشی ٹوٹ کھوٹ میں کوئی بھی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔ عین اسی زمانے میں یورپ کے اس سیاسی استبداد و تسلط اور معاشی استحصال کے خلاف دنیا نے اسلام میں رد عمل ہوتا ہے، اور وہاں مختلف ناموں سے اصلاحی تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ اس رد عمل کی روداد ہنگری کے مستشرق جبرائیل کی زبان سے سنئے۔

لیکن اسلامی دنیا میں یورپ کی یہی دخل اندازی تھی، جس نے آخر کار چسپیدہ اور منتخب مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے عوام اور مذہب کی خاطر اٹھیں۔ چنانچہ جہاں جہاں یورپی تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کو یورپی افکار سے سابقہ پڑا، وہاں ان کی بیداری نے سب سے زیادہ شورش انگیز صورت

اختیار کی یہ سمجھتے ہوئے کہ مذہب ہی کے اختلاف نے مسلمان اقوام کو اتنا پیچھے ڈال دیا ہے، وہ اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ کرنے لگے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کی عظمت کا ذکر کرتے۔ اور اس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے۔ عہد حاضر میں احیائے اسلام کی یہ تحریکیں تقریباً ایک ہی زمانے میں مختلف ملکوں میں اٹھیں۔ اگرچہ اپنی ظاہری شکل میں یہ ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف تھیں لیکن ان سب کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ صحیح اور حقیقی اسلام کا احیاء ہو تاکہ اس طرح مسلمانوں کو پھر وہ عظمت و سر بلندی حاصل ہو جو تاریخ اسلام کے اولین دور میں انہیں حاصل تھی۔

احیائے اسلام کی یہ تحریکیں اگرچہ جبرمالوس صاحب کے الفاظ میں یورپ کی دخل اندازی کا نتیجہ تھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی سوتلی بہن پہلے سے عالم اسلام میں بھوٹ چکی تھیں اور ان سے بہت سے ملکوں کے اہل علم کسی نہ کسی حد تک مستفید ہو چکے تھے۔ آخری صدیوں میں اندھی تقلید اور جمود کے خلاف سب سے پہلی آواز امام ابن تیمیہؒ کی تھی۔ وہ ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ امام ابن تیمیہؒ کے زمانے میں تقلید شخصی رائج ہو گئی تھی۔ ہر بات کا جواب اپنے مذہب اور مسلک کی کتابوں سے دیا جاتا تھا۔ فقہی امور میں تو یہ تقلید جامد ہو گئی تھی امام موصوف نے سب سے پہلے یہ طریقہ بدلائ مختلف علوم و فنون کا کوئی جزئی سے جزئی مسئلہ کیوں نہ ہو، سب سے پہلے وہ قرآن مجید میں اس کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے اس کے بعد بہترین حدیث اور فقہ کے حوالے دیتے تھے۔ ان کے اس نئے طرز تحریر نے علماء کے اندر قرآن مجید اور حدیث نبوی میں تدبر و تفکر کرنے کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیا۔ ان کی تصنیفات سے نہ صرف ان کے زمانے کے علماء کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہوئی بلکہ ان کے بعد سے ہر ایک دور کے علماء کے خیالات اور ان کی تحریروں پر ان کا اثر پڑنے لگا۔ امام ابن تیمیہؒ نے خود بھی قرآن و حدیث کا خوب چرچا کیا اور عام لوگوں کو بھی اس کی طرف توجہ دلائی، جس سے عام مسلمانوں میں شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا ہونے کا ایک خاص احساس پیدا ہو گیا۔ لے

امام ابن تیمیہؒ کی دعوت ان کے قابل شاگردوں اور ان کی کتابوں کے ذریعہ دور دور تک پہنچی اور اس نے دنیائے اسلام میں جمود اور اندھی تقلید کے خلاف ایک لہر پیدا کر دی۔ جس سے بہت سے اہل

علم متاثر ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی بارہویں صدی کے وسط میں جب مدینہ منورہ پہنچے، تو وہاں بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔ ابن تیمیہ اور ابن القیم دونوں کی کتابیں حضرت شیخ ابراہیم کورانی (متوفی ۱۱۰۱ھ) والشیخ ابوطاہر کمرہی استاد حدیث شاہ صاحب کی وسعت نظر و بلندی مشرب کی وجہ سے ان کے مطالعے میں رہ چکی تھیں۔ اس مطالعہ کی جھلک شاہ صاحب کی کتابوں میں کافی نظر آتی ہے۔

اس ضمن میں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ بے شک شاہ صاحب امام ابن تیمیہ کی دعوت کتاب و سنت سے متاثر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصوف و معرفت میں ابن عربی اور مجدد الف ثانی سے بھی اثر لیا اور خاص طور سے اکبری دور میں سرزمین ہندوستان میں عقلیت اور حکمت عملی کو جو فروغ حاصل ہوا تھا انھوں نے اسے بھی ایک حد تک اپنایا۔ اور ان تینوں رجحانات کو سمونے کی کوشش کی۔ مصر، شام اور جزیرہ عرب کے مختلف حصوں میں امام ابن تیمیہ کے اثرات براہ راست پڑے، اور منتشر شدین کا دائرہ وقت کے ساتھ ساتھ برابر وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پروفیسر محمد الوزہرہ کے الفاظ میں نجد میں امام محمد بن عبدالوہاب کی دعوت تجدید و اصلاح کے نتیجے میں بارہویں صدی ہجری میں محمد بن سعود نے ابن تیمیہ کے مسلک کی تبلیغ و اشاعت اور تائید و حمایت کے لئے تلوار میان سے نکالی یہ چھوٹی سی مملکت "سعودیہ" افکار ابن تیمیہ پر عمل پیرا ہو گئی۔

چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں سید جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید شیخ محمد عبدہ نے مصر میں اپنی اصلاحی تحریک شروع کی، جس کے اثرات ان کے شاگردوں کی بدولت دنیائے اسلام کے دور دراز حصوں تک پہنچے۔ وہ محمود اور اندھی تقلید کے خلاف تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "اسلام نے علی الاعلان بیان کیا کہ انسان اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ کوئی اس کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچتا پھرے۔ بلکہ اس کی فطرت یہ ہے کہ علم سے کائنات کی نشانیوں سے اور واقعات و حوادث کے آثار سے ہدایت حاصل کرے اور حقیقی معلم وہی ہے جو لوگوں میں تحقیق کے ذوق کو پیدا کرے انہیں رشد و ہدایت کے راستے پر چلائیں مشہور مستشرق گولڈزہیر نے شیخ محمد عبدہ کی تحریک اصلاح کے تین عوامل بتائے ہیں۔ امام غزالی کے اخلاقی و مذہبی تصورات۔ دوم تیرھویں صدی عیسوی کے دو موحدین ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن القیم الحزری

کے حد سے زیادہ سلفی رجحانات اور سوم زمانہ حاضری ترقی کے مطابقت سے مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ اسی زمانے میں برصغیر پاک و ہند میں سرسید، دیوبند اور بعد میں مولانا شبلی اور ان کے ندوۃ العلماء کی اصلاحی، تعلیمی اور دینی تحریکیں اٹھیں۔ ترکی میں تنظیمات کے نام سے اصلاحی اقدامات ہوئے اور اندونیشیا میں شیخ محمد عبیدہ کے شاگرد شیخ رشید رضا کے رسالے "المنار" کا اثر پھیلا گو یہ سب تحریکیں جمود اور اندھی تقلید کی مخالفت کرتی تھیں اور مسلمانوں کو نئے دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دیتی تھیں لیکن ان سب کا زور اسی پر تھا کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بنیں اور اسلام میں اس کے طویل عہد زوال میں ادھر ادھر کی جو رطب و یابس چیزیں شامل ہو گئی ہیں، ان کا انکار کر کے وہ اصل اسلام کی طرف لوٹیں۔ قدرتی طور پر اس مذہب میں، جو یہ مانتا ہے کہ اس کے پاس ہدایت کا آخری اور مکمل سرچشمہ خدا کی کتاب کی شکل میں موجود ہے، اصلاح و تجدید کے معنی یہی ہوں گے کہ اس سرچشمہ ہدایت کی طرف لوٹ جائے، اور اس سے استفادہ کیا جائے۔ ان تمام اصلاحی تحریکوں میں جو کم و بیش بیسویں صدی کے ربع اول تک دنیائے اسلام میں مقبول رہیں، یہی رجحان غالب تھا۔ وہ سب کی سب عہد نبوت اور خلافت راشدہ کو ایک مثالی دور سمجھتی تھیں، اور ان کے پیش نظر اصلاح سے مراد اسی دور کا احیاء تھا۔ مولانا طغر علی خان مرحوم عوامی جلسوں میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اکثر اس رجحان کا اظہار اپنے اس تاریخی فقرے میں یوں کیا کرتے تھے: "یہ ایسی الٹی زندقہ لگاؤ کہ جہاں تم تیرہ سو سال پہلے تھے، وہاں پہنچ جاؤ۔"

یہ مختصر سا خاکہ ہے ان اصلاحی تحریکوں کا جو موجودہ تحریکوں سے، جو اس وقت عالم اسلام میں چل رہی ہیں، پہلے کی ہیں۔ اب مختصر موجودہ یعنی جدید اصلاحی تحریکوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک لبنانی اہل قلم حسن ساب لکھتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلام کو دور حاضر کے جس چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، وہ مغرب یعنی اکثر و بیشتر مغربی یورپ، مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے روس اور امریکہ کی طرف سے تھا اور آج اسلام کو جس چیلنج سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہ کئی اطراف سے ہے۔ یعنی مغرب سے، کمیونسٹ مشرق سے اور کافی حد تک ہندوستان اور افریقہ کی قومیتوں اور ان کی ترقی پسندی (پروگریسیو ازم) سے۔ موصوف کے الفاظ میں: "یہ تنگ اسلام ان تمام چیلنجوں پر غالب آیا، جن سے اسے اپنے ابتدائی ادوار میں سابقہ

پڑا لیکن آج وہ جس چیلنج سے رُدر رُدر ہے، وہ ان تمام سے مختلف ہے، جن سے وہ اس سے پہلے عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ جہاں تک مغربی استعمار سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کا تعلق ہے، اسلام اس میں یقیناً کامیاب رہا ہے اور الحزبِ اُمّی کی جدوجہد آزادی اس کی روشن ترین مثال ہے لیکن سیاسی آزادی کے حصول کے بعد عہد حاضر کے چیلنج سے نبرد آزما ہونے کی جدوجہد آزاد اسلامی ملکوں میں شروع ہو رہی ہے۔ رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے موجودہ مسلمانوں کے اس مرحلے کو جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹنے کا ضرور نام دیا ہوتا۔ یعنی اب تک ان کی جدوجہد دوسروں کے خلاف تھی، اور اب انہیں خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ عہد حاضر کی شکل میں اسلام کو آج جس چیلنج سے سابقہ پڑ رہا ہے، وہ مختصراً مشتمل ہے ایک مختلف نوعیت کے علم کی بے اندازہ طاقت، ایک مختلف نوعیت کی تنظیم اور ایک مختلف طرز زندگی پر۔ اس چیلنج کے رد عمل کے طور پر مسلمانوں میں جو اصلاحی رجحانات پیدا ہوئے، وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ہمارے ہاں جو کچھ تھا، وہ عہد حاضر نے جو کچھ ہمیں دیا ہے، اس سے بہتر ہے۔ اس لئے ہمیں اس مثالی دور کی تجدید کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ عہد حاضر میں ٹیکنالوجی میں جو ایجادات ہوئی ہیں، انہیں اپنالینا چاہئے۔ یہ مسک آج سعودی عرب کی ریاست، سنوسیوں، جماعت اسلامی، اخوان المسلمین، حزب التحریر اور دار السلام کا ہے۔

۲۔ ہمارے ہاں جو کچھ تھا، اس میں بعض اچھائیاں ہیں اور عہد حاضر نے جو کچھ دیا ہے، اس میں بھی اچھائیاں ہیں۔ ہمارا طریقہ اصلاح یہ ہونا چاہیے کہ اپنے ہاں کی باقیات صالحات کی تجدید کریں اور اس میں عہد حاضر کی اچھائیاں بھی شامل کر لیں۔ یہ مسک جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدالرضا، علی عبدالرازق، ابن بادیس اور ان کے متبعین کا ہے، جن میں علمائے دین بھی ہیں، مفکر بھی ہیں اور سیاسی لیڈر بھی۔ عرب دنیا، پاکستان، ایران اور انڈونیشیا کی زیادہ تر قومی جماعتیں کسی نہ کسی حد تک اسی مسک سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔

۳۔ جو کچھ ہمارے پاس، خواہ وہ اچھا تھا یا بُرا، اس کا دورِ سینہ گیا اور عہد حاضر نے جو کچھ دیا ہے، وہ اس پر سبقت لے گیا ہے۔ اس لئے اسے ہمیں آج کلیتہً اپنالینا چاہیے۔ باقی رہا مذہب کا سوال، تو یہ ایک شخص کا نجی معاملہ ہے، اور اس میں اسے آزادی ہونی چاہیے۔ اس مسک کا سب سے نمایاں علم بردار نر کی شاعر ضیا گوکپ تھا۔ جس کے افکار نے کمالِ ازم کی شکل اختیار کی، اگرچہ مہر کے ڈاکٹر طحٰ حسین بھی اسی راہ پر چلے، لیکن وہ

ایک مقام پر جا کر رُک گئے اور اب ان کا نقطہ نظر کچھ درمیان درمیان ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے اسلام میں ایک اور رجحان بھی ابھر رہا ہے اور وہ مارکسزم کا ہے۔ اس کے پیش نظر

اسلام اور قرآن سے قطع نظر کر کے مکمل طور پر تبدیل لانا ہے۔ اس رجحان کے سوا اس وقت مسلمان ملکوں میں بھی جو اصلاحی تحریکیں چل رہی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی قرآن مجید سے انکار نہیں کیا جا رہا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض مصلحین اس کے من ماسنے معنی کرتے ہیں۔ اس کی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں، اور حقیقی اہمیت اسے دینی چاہتے نہیں دیتے، لیکن قرآن کا انکار کوئی بھی نہیں کرتا۔

اور پر جن تین مسکوں کا ذکر ہوا ہے، ان میں سے پہلے مسک پر آج پورے عالم اسلام میں صرف سعودی حکومت ہی عمل پیرا ہے۔ اس کے محکمہ "امر بالمعروف" کے سربراہ محمد بن سلمان نے قومیت اور اسلام کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں ایک جگہ وہ اپنی حکومت کے طرز عمل کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں: "اسلام دنیا کا بہترین اصول اور موزوں ترین طریقہ حیات ہے۔۔۔۔۔ اس ملک میں صرف ایک ہی اصول اور ایک ہی دعوت پیش کی جاسکتی ہے، اور وہ اسلام کا اصول اور دعوت ہے۔ یہ واحد مملکت ہے جو اس زمانے میں خدا تعالیٰ کی توجید، قرآن کے احکام، رسول اکرمؐ کی سنت اور سلف صالح کے نظریات پر قائم ہوئی ہے"۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی مملکت میں کوئی نئی چیز اس وقت تک اختیار نہیں کی جاسکتی، جب تک کہ پہلے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں۔ یعنی ان کے نقطہ نظر سے۔

دوسرے مسک والے جس کے علمبردار سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبیدہ مصر میں اور سرسید اور ان کے ہم خیال برصغیر میں تھے، اسلام کو دین عقل قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک جو چیز عقل کے معیار پر پوری اُترتی ہے، وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ ان کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور آج سیاسی و انتظامی و معاشی نظم و نسق حکومت کے لئے جو تبدیلیاں ناگزیر ہیں وہ ان کے حق میں تھے۔ چنانچہ شیخ محمد عبیدہ نے بنک کے منافع کو جائز قرار دیا تھا۔

اس مسک پر چلتے ہوئے آج ایک مسلمان مملکت اپنے ضابطہ قوانین میں فقہی قانون کے ساتھ ساتھ سیکولر قانون کو شامل کر سکتی ہے۔ وہ ایک جدید طرز کا آئین اختیار کر سکتی ہے اور اس کے ساتھ یہ صراحت بھی کر دیتی ہے کہ اس کا سربراہ اور صدر مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ آج اکثر عرب ملکوں، پاکستان اور ایران کا اس پر عمل ہے اور اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہ بنے جو قرآن کی روح کے خلاف ہو۔ اس مسک کے حامیوں میں سے لبنان کے ایک پروفیسر المحمصانی ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "فلسفہ اصول فقہ اسلامی" میں لکھا ہے: "مسلمانوں کے لئے جو قوانین قرآن کی نئی تعبیر کرنے

کی اجازت دی ہے۔ ان کے نزدیک اس نئی تعبیر کے لئے ضروری ہے کہ پہلی تعبیر جن حالات و اسباب کی بنا پر ہوئی، وہ بدل چکے ہوں۔ اسی طرح مصلحت عامہ اور ضرورت عامہ کے ماتحت بھی قرآن کے مفہوم کی نئی تعبیر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ موصوف کے اس نقطہ نظر کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان خود قانون ساز کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن مجید کے ظاہری الفاظ کے پابند رہیں، صرف اس کی روح کی پابندی ہونی چاہیے۔ اسی مسلک کے تتبع میں مصر نے شرعی عدالتوں کو جواب تک وہاں چلی آرہی تھیں، جدید رسول عدالتوں میں مدغم کر دیا ہے اور پورے ضابطہ قوانین پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔ اور تیونس میں ایک نئے قانون کے ذریعہ تعداد و واج کو ممنوع قرار دیا گیا ہے

اب رہا تیسرے مسلک کا معاملہ، جس پر کمالی ترک کا مزین ہیں، وہ زیادہ سیدھا سادا اور جرات مندانہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے اجتہاد کا حق جو اسلام کی رو سے مسلمانوں کو حاصل ہے، صحیح حق داروں یعنی عوام کے نمائندوں کو دے دیا ہے۔ اور اب ان پر مشکل قومی اسمبلی قانون بنانے کی مجاز ہے۔ بعض غیر ترک اہل الرائے نے بھی جن میں علامہ اقبال مرحوم شامل ہیں، اجتہاد کے بارے میں کمالی ترکوں کے اس نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اجماع کے یہ معنی لئے ہیں کہ جب ترک قوم کا اپنے ہاں سیکولر نظام حکومت قائم کرنے پر اجماع ہو جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے قرآن کو ترک کر دیا ہے! الغرض آزاد مسلم مملکتوں کو جیسے جیسے اپنے مسلمان عوام کے لئے قانون سازی کرنی پڑ رہی ہے، ان کے ہاں دوسرا اور تیسرا مسلک جن کا ادھر ذکر ہو چکا ہے، قریب آتے جا رہے ہیں اور ترک کی جیسا سکولر ملک بھی نئے قوانین اور نئی تبدیلیوں کے جواز کے لئے قرآن و سنت کی نئی تعبیرات سے استمداد کرتا ہے۔

بنانی مضمون نگار کے الفاظ میں اگر پہلے مسلک کے حامی قدامت پسندوں اور سلفین کا گروہ عقل و استدلال اور تاریخی تغیر و تبدل کے درمیان صحیح ربط پیدا کرنا سیکھ لے جس کی تلقین خود قرآن مجید نے کی ہے، تو یہ تینوں مسلک :- ایک قدامت پسندوں کا، دوسرا اعتدال پسندوں کا، اور تیسرا انتہا پسندوں کا۔ ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں اور سب مل کر قرآن کے بتائے ہوئے صحیح راستہ پر چل سکتے ہیں۔

دنیاۓ اسلام میں آج جتنی بھی اصلاحی کوششیں بروئے کار ہیں، سوائے مارکسزم کے متبعین کسب اپنے استدلال میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ ان میں بعض کے استدلال کو خواہ آپ کھلی تحریف کا نام دیں اور ان کے خلاف علمائے کرام

قرآن کے انکار کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اور سیکولر سے سیکولر مسلمان بھی تجدد و اصلاح کے حق میں قرآن ہی سے مدد لیتا ہے البتہ وہ اس کے مفہوم کی نئی تعبیر کرتا ہے۔ یہ رجحان بہت حد تک اسلام اور مسلمانوں کے لئے خوش آئند ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا قومی ضمیر مسلمان رہتے ہوئے دورِ حاضر کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اور اس کے نزدیک آج کی معاشی اجتماعی اور سیاسی ضرورتیں اسلامی رُوح کو برقرار رکھتے ہوئے پوری کی جاسکتی ہیں۔ اور جدید بننے کے لئے ضروری نہیں کہ قدیم کا سرے سے انکار ہو۔ بلکہ قدیم اور جدید میں ہم آہنگی پیدا کر کے امت مسلمہ آگے بڑھ سکتی ہے۔

جہاں تک عقائد کا تعلق ہے، اسلام نے توحید، رسالت، انسانیت اور اخلاقِ عامہ کے بارے میں جو تصورات دیئے ہیں، جب بھی ان کا مقابلہ دوسرے مذاہب کے ان تصورات سے ہوا ہے اسلام ہمیشہ غالب رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بہت کم لوگ اسلام ترک کر کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کو اختیار کرتے ہیں۔ مسلمانوں پر ایک بڑی ابتلا یورپی اقوام کی سیاسی غلامی تھی۔ خدانے کیا اس سے انھیں نجات مل گئی ہے۔ اب ان کے سامنے اپنی معاشی و سماجی پس ماندگی کو دور کرنے کا مسئلہ ہے۔ اور یہ اتنا نظر یاتی نہیں، جتنا عملی ہے اس میں خیال آرائی نہیں۔ اقدام چاہیئے۔ اس صورتِ حالات نے کہ ایک طرف ان پر مشرق کی طرف سے کمیونسٹ ملکوں کی یلغار ہو رہی ہے اور دوسری طرف امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے ان پر ہلہ بول دیا ہے، اس مسئلے کو اور بھی نازک، پیچیدہ، اہم اور خطرناک بنا دیا ہے۔ یہ اسلام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے اور یہ چیلنج محض عقائد، نظریات اور لبرلزم کی قسم کا سطحی نہیں، بلکہ یہ افراد اور قوموں کی مجموعی زندگی کو محیط ہے اور اس کا جواب مثبت عمل، نتیجہ خیز عمل اور مجموعی عمل سے ہی دیا جاسکتا ہے۔

لبنانی مضمون نگار کے الفاظ میں: "سماج روحانیت سے بے تعلق ہو جائے، تو اس کا کچھ بھی حشر ہو سکتا ہے اور اگر روحانیت کی جڑیں سماج میں نہ ہوں تو وہ بجاطور سے مارکس کی افیون ہو سکتی ہے۔ ہم نے بار بار اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ اسلام ان دونوں کا جامع ہے اور دونوں کو باہم ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ اسلام کی منفرد اور امتیازی خصوصیت ہے، جو اس سے کسی حال میں چھٹنی نہیں چاہیئے۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سماج اور روحانیت کا باہمی تعلق حرک کی اور نمود پذیر ہے نہ کہ جامد۔ دنیا کی مادی زبان میں روحانیت کا سرچشمہ انسان بحیثیت فرد کے ہے اور سماج کا سرچشمہ انسان بحیثیت جماعت کے۔"

"آج انسانیت کے روحانی مستقبل کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس ضمن میں اسلام کدھر جائے گا اور کیا کرے گا۔ اسلام نے اپنی ابتدائی صدیوں میں مغرب کی توحید پرستی اور مشرق کے کائنات ہی کو ذاتِ الہ سمجھنے والے عقیدہ وحدت الوجود میں ایک تخلیقی رشتہ پیدا کیا تھا۔ آج ان دونوں اور مادی وحدانیت (MONISM) کے درمیان ایک تخلیقی رشتہ بننے کے لئے اسلام کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ان صدیوں کی حرکی اور تغیر قبول کرنے والی روح کو آزادی، انصاف اور نظم و ضبط کے تخلیقی ودائر میں کار فرما کرے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنی ابتدائی صدیوں میں سامی عقیدہ توحید۔ جس میں ذات الہی کی تنزیہ پر زیادہ زور تھا، اور آریائی عقیدہ وحدت الوجود کے درمیان، جس میں کائنات ہی کو ذاتِ الہ مانتے کار جنان غالب ہے، جو ایک تخلیقی رشتہ پیدا کر کے اس عہد میں ایک مرکزی انسانی فکرمہم کیا، اور جسے آج مادی وحدانیت یعنی مارکسزم کو اپنے اس مرکزی انسانی فکرمہم سے ہم آہنگ کر کے ان دونوں میں پہلے کی طرح ایک تخلیقی رشتہ پیدا کر رہے، غرض اسلام کا میشن مسلمانوں کے کس طبقے کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہو سکتا ہے۔ آج ہمارے ہاں سب سے اہم سوال یہی ہے۔

جہاں تک سکہ بند علماء کی اکثریت کا تعلق ہے ہمارے نزدیک یہ حضرات اس راہ میں روک تو ہو سکتے ہیں، لیکن مدد و معاون نہیں۔ کیونکہ ایک تو بحیثیت مجموعی وہ اس فکری خلا کو جو گزشتہ آٹھ سو سال کے جمود نے ان کے ذہنوں میں پیدا کر دیا ہے، پُر کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ دوسرے ان کے جماعتی مفادات زیادہ تر ہر تبدیلی کے مخالفوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ چنانچہ ان کی طرف سے اس قسم کے ہر اقدام کی مخالفت ہوگی اور اگر کسی ملک میں ان علماء کو برابر غلبہ حاصل رہا، تو اس کا بہت امکان ہے کہ عہد حاضر کی شدید اور فوری ضرورتیں اس ملک کو دوسری انتہا پر لے جائیں۔ اور قدامت پرستی کا رد عمل بے عنان آزاد روی ہو، جو ظاہر ہے، اچھا نہیں ہوگا۔

